رسالہ "مسائل فی معرفۃ اللّٰہ" للغزالی

تقدیم و ترجمہ: محمد الغزالی (☆)

حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد بن محمد بن احمد الغزالی (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) کا جو مقام و مرتبہ اسلام کی فکری اور روحانی تاریخ میں ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں - آپ کا تعلق اسلامی تاریخ کے اس عہد زریں سے ہے جب مسلمان فلاسفہ' سائنس دان اور مفکرین کے ہاتھوں دنیائے اسلام کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے علمی اور ثقافتی مراکز میں اس زمانہ کے جملہ رائج الوقت علوم و فنون میں بے مثال ترقی اور توسیع ہو رہی تھی - اس دور میں جہاں خالص دینی علوم یعنی علوم قرآن و حدیث' فقہ' اصول اور کلام وغیرہ کی محکم بنیادیں ڈالی جا رہی تھیں وہاں دوسری طرف فلسفہ' ادبیات' منطق' طبیعیات' طب' ریاضی اور فلکیات وغیرہ کے ساتھ ساتھ مختلف حرفتوں اور صنعتوں کو فروغ حاصل ہو رہا تھا - مسلمانوں کو مسلسل حاصل ہونے والی فتوحات اور بعض دوسرے عوامل کے نتیجہ میں علمی ترقی کے نئے نئے مواقع اور میدان میسر آ رہے تھے۔ مسلمان علماء اور حکماء نے دیگر تہذیبوں سے جو علوم و افکار کا سرمایہ حاصل کیا تھا ان کو نہایت دلچسپی اور عرق ریزی کے ساتھ نہ صرف عربی زبان میں منتقل کر ڈالا تھا بلکہ ان علوم و افکار سے جنم لینے والے بیسیوں مسائل اور مباحث بھی فلاسفہ اور متکلمین کے مناقشات کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ ان حضرات نے بڑی خود اعتمادی اور بصیرت کے ساتھ ان مسائل پر تنقیدی بحث کی اور ان کو منقح کر کے ان کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر واضح کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب مسلم معاشرہ میں علمی بیداری اور فکری سرگرمی کی ایک عام لہر آئی ہوئی تھی۔ حکومت وقت بھی اس ہمہ گیر علمی ترقی کے فروغ میں شامل تھی۔ عباسی خلفاء اور امراء کی خصوصی سرپرستی اہل علم و دانش کو حاصل تھی۔ کئی باقاعدہ درسگاہیں اور مراکز ترجمہ و تحقیق سرکاری مصارف سے چل رہے تھے۔ انہی وقیع اور دور رس اثرات کے حامل اداروں میں ایک اہم مرکز علم و تدریس بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس ادارہ نے زمانہ بھر کے اہل علم و فکر کو جمع کر لیا تھا۔ آسمان

(☆) ایسوسی ایٹ پروفیسر' ادارہ تحقیقات اسلامی' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد

علم و حکمت کے ان درخشاں ستاروں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس ادارہ سے وابستہ رہے اور مسلمانوں کی علمی تاریخ کا قابل فخر سرمایہ بنے۔ ان اساطین علم و فکر میں مشہور زمانہ متکلم امام الحرمین جوینی (۴۱۹ھ - ۴۷۸ھ) بھی ہوئے ہیں جو امام الغزالی کے استاد اور مدرسہ نظامیہ کی سربراہی میں ان کے پیش رو تھے۔ مدرسہ نظامیہ بھی اور ایسے دیگر اداروں کو اس زمانہ کی اصطلاح میں مدارس کا نام دیا گیا تھا لیکن اپنی وسعت، ہمہ گیری اور معیار کے لحاظ سے انہیں آج کل کی کسی بھی بڑی سے بڑی یونیورسٹی کے ہم پلہ ہی سمجھنا چاہئے۔

بغداد کے اس مدرسہ نظامیہ سے امام غزالی تقریباً چار سال تک وابستہ رہے (۴۸۴ھ - ۴۸۸ھ) اور عالم اسلام کی اس بے مثال درسگاہ میں امام صاحب کو مرکزیت حاصل رہی اور وہ خواص و عوام دونوں کی توجہ اور توقیر کا مرکز بنے رہے۔ امام غزالی کی اس علمی بادشاہت کا آفتاب نصف النہار پر تھا جب امام صاحب کی سوچ کا رخ بدلا اور آپ پر زہد اور ترک دنیا کا غلبہ ہوا۔ آپ نے اپنی تمام سرگرمیوں پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی اور یہ محسوس کیا کہ جوں جوں علمی وجاہت اور دینی مرجعیت انہیں حاصل ہوتی گئی ہے توں توں اخلاص کا عنصر دبتا گیا ہے اور ریاء اور جب جاہ غالب آنے لگی ہے۔ ایک طویل اور گہرے غور و فکر کے بعد وہ وقت آیا کہ جب یکایک سب کچھ چھوڑ کر امام صاحب نے بغداد کی دلچسپیوں کو خیرباد کہا اور اقلیم علم و فکر کے تخت شاہی کو ٹھوکر مار دی۔ تمام دنیاوی علائق سے یکسر کنارہ کش ہو کر آپ نے عزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ اور دمشق جا کر مجاہدہ اور ریاضت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے امام غزالی کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس سے پہلے علم، تدریس، مناظرہ اور مباحثہ کا رنگ ان پر چھایا ہوا تھا اب تصوف، روحانیت اور للہیت کا مشرب و مذاق ان پر غالب آ گیا۔ خالص علمیت سے روحانیت کی جانب اس سفر کی روئیداد انہوں نے اپنی مشہور کتاب "المنقذ من الضلال" میں بیان کی ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ اس دوسرے دور میں انہوں نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "احیاء علوم الدین" بھی تصنیف فرمائی جو اپنی نوعیت کی ایک بے مثال کتاب ہے اور حکمت نبوی کا ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جس کی اہمیت ایک ہزار سال بیت جانے کے باوجود آج بھی کم نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں امام صاحب نے علم و عمل، عقل و نقل، دنیا اور آخرت اور

قلب و دماغ کے مابین توازن و توافق قائم کرنے کی اہمیت واضح کی ہے اور اس مقصد کے لئے ایک واضح اور محکم فکری اور عملی نظام وضع کیا ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کے حقیقی مسائل سے علوم دین کا رابطہ استوار کر کے دکھلایا ہے کہ علوم دین کی رہنمائی میں اللہ کی رضا کے حصول کا راستہ کیا ہے' اس کی مشکلات کیا ہیں اور ان کو کس طرح سے سر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح امام صاحب نے علوم دین کا احسان اور تزکیہ کے ساتھ ناقابل شکست رشتہ قائم کر کے یہ دکھلا دیا کہ ان دونوں امور کے اشتراک سے ہی دینی زندگی کا خمیر بنتا ہے اور ان کے مابین توافق ہی اسلام کا جوہر ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب نے اسلام کے فلسفہ اخلاق کی ایسی راسخ بنیاد فراہم کر دی جس پر آگے چل کر بے شمار علماء اور محققین اسلامی فلسفہ اخلاقیات کی عمارت تعمیر کرتے رہے۔ اس تصنیف کا کمال یہ تھا کہ اس نے بیک وقت علماء اور عوام دونوں کو متاثر کیا کہ اس میں حکمت اور موعظت کا حسین اور نادر امتزاج قائم کر کے دکھلایا گیا تھا۔ عموماً امام صاحب کی ایک دیگر تصنیف "تہافت الفلاسفہ" کو ان کا اصل علمی کارنامہ مانا جاتا ہے جس میں انہوں نے فلاسفہ یونان اور ان کے تلامذہ کے مابین متداول بنیادی عقلی مقدمات کا ابطال کیا ہے۔ لیکن در حقیقت "احیاء علوم الدین" ہی ان کا اصل کارنامہ ہے جس نے بعد میں آنے والوں کے لئے دینی فکر و عمل کا ایک نیا اور واضح رخ متعین کر دیا۔

امام غزالی نے تقریباً سو کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے بنیادی موضوعات فلسفہ' روحانیات' عقائد' کلام' تفسیر' حدیث' اصول فقہ' فلسفہ اخلاق اور فلسفہ علم وغیرہ ہیں۔ ان تصنیفات میں کچھ تو خاصی ضخیم اور جامع ہیں جیسے "احیاء علوم الدین" اور "المستصفیٰ فی اصول الفقہ" وغیرہ اور کچھ متعین مسائل پر کتابیں اور مختصر رسالے ہیں۔ ان ہی مختصر تصنیفات میں سے ایک آپ کا رسالہ "مسائل فی معرفۃ اللہ" بھی ہے جو دراصل چند کلامی نوعیت کے سوالات کا جواب ہے جو آپ سے کئے گئے تھے۔

امام صاحب کے اس رسالہ کو منظر عام پر لانے کا سہرا دو اصحاب کے سر ہے۔ ۱۹۵۳ء میں لبنان کے ایک عیسائی پادری جناب رچرڈ میکارتھی الیسوعی نے مشہور متکلم ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری (۲۶۰ھ - ۳۲۴ھ) کی معروف تصنیف "کتاب اللمع فی الرد علی اہل الزیغ و البدع" شائع کی تھی۔ امام اشعری وہ شخص ہیں جن سے مشہور کلامی مدرسہ اشاعرۃ منسوب ہے اور وہی

اس کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ میں امام شافعیؒ کے مسلک سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ بطور ایک متکلم کے امام غزالیؒ کا تعلق بھی مدرسہ اشاعرۃ سے رہا ہے اگرچہ امام صاحب نے بہت سے مسائل کلام میں اپنی آزادنہ رائے بھی قائم کی ہے لیکن مجموعی طور پر وہ اس فکری دائرہ کے اندر رہتے ہیں اور اس مدرسہ کے مذاق کے مطابق معتزلہ کی انتہاء پسندانہ عقلیت کے خلاف آپ کے متکلمانہ خیالات کا رخ رہا ہے۔ پادری رچرڈ میکارتھی الیسوعی نے امام اشعری کی "کتاب اللمع" کے سلسلہ میں اس مخطوطہ پر انحصار کیا ہے جو جامعہ امریکیہ بیروت کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس کا نمبر (MS 297.3A 81 1A) ہے یہ مخطوطہ تین متون پر مشتمل ہے جن میں پہلا متن تو امام اشعری کی اسی کتاب اللمع کا ہے۔ دوسرا متن امام غزالی کے "الرسالۃ اللدنیۃ" کا ہے جب کہ اس مخطوطہ میں شامل تیسرا متن چند سوالات پر مشتمل ہے جو امام غزالیؒ سے کئے گئے تھے اور جن کا جواب آپ نے دیا ہے۔ اس مخطوطہ کا پہلا متن یعنی کتاب اللمع ۱۱۷ صفحات پر محیط ہے اور دوسرا "الرسالۃ اللدنیۃ" ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے جب کہ حجم کے اعتبار سے سب سے مختصر متن "مسائل فی معرفۃ اللہ" کا ہے جو ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطہ میں شامل دوسرا متن "الرسالۃ اللدنیۃ" للغزالی ۱۳۲۸ھ میں قاہرہ میں شائع ہوا تھا اور ایک خاتون قلم کار مارگریٹ سمتھ نے اس کو انگریزی میں منتقل کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّہ کے شمارہ بابت ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس مخطوطہ کے تیسرے متن کو لبنان کے مشہور فاضل جناب نبیہ امین فارس نے ایڈٹ کیا اور جامعہ امریکیہ بیروت کے مجلّہ "الابحاث" کے شمارہ جون ۱۹۶۱ء میں (ص ۲۰۶۔ ۲۲۲) شائع کیا۔ فاضل محقق جناب نبیہ امین فارس نے رسالہ کی تحقیق کے دوران جہاں متن کو مبہم محسوس کیا یا کوئی لفظ محو دیکھا تو اس کی جگہ ایسے الفاظ سے پر کر دی جس سے مضمون مکمل ہو جائے۔ ایسا انہوں نے صرف ۹ مقامات پر کیا ہے اور ان تمام مقامات پر صرف ایک ہی لفظ بڑھانے کی ضرورت تھی جس سے مضمون واضح ہو گیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے رسالہ میں وارد آیات قرآنی کے حوالے بھی دے دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ محقق کے حاشیہ میں کوئی اندراج نہیں۔

اس رسالہ میں سات ایسے بنیادی سوالات اٹھائے گئے ہیں جن کی اہمیت آج کے علمی تناظر میں بھی تقریباً وہی ہے جو امام صاحب کے زمانہ میں تھی۔ یونانی دور سے لے کر آج تک

فلسفہ کی معلوم تاریخ میں علم انسانی کی حقیقت کی دریافت ایک بنیادی فلسفیانہ مبحث رہا ہے۔ علاوہ ازیں مطالعہ ادیان میں "ذات باری یا مطلق ہستی کا ادراک" اور "متناہی کا لامتناہی کے متعلق علم" اور اس علم کی حدود' جیسے مسائل پر مسلسل بحث رہی ہے' جب کہ مسلمان متکلمین کے ہاں اللہ تعالی کا بندوں پر اقتدار' اور انہیں طاعت کا مکلف کرنے اور انسانی اعمال پر جزا اور سزا مقرر کرنے کی حکمت' وغیرہ ایسے امور رہے ہیں جن پر تقریباً ہر ایک قابل ذکر متکلم نے بحث کی ہے۔ اس رسالہ کا موضوع یہی مسائل ہیں اور امام صاحب نے بڑے سہل اور مؤثر انداز میں ان دقیق اور پیچیدہ سوالات کی گتھیاں سلجھائی ہیں۔ آج کے دور میں اس مضمون کی افادیت اور خود اس کے بلند پایہ مصنف کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے مناسب جانا کہ اس رسالہ کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ (مترجم)

حبر الانام حجۃ الاسلام محمد الغزالی ' اللہ ان کی روح کو مقدس اور ان کی قبر کو منور کرے' سے پوچھے جانے والے چند سوالات:

سوال نمبر ۱: حجۃ الاسلام اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو اللہ تعالی کی معرفت رکھنے اور اس کی ذات و صفات کی حقیقت کاملہ کا احاطہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہو' کیا یہ ممکن ہے؟ اور کیا اس کا دعوی کرنے والا سچا گردانا جا سکتا ہے؟ باوجود اس حقیقت کے کہ جسمانی اور روحانی امور کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی ماہیتیں پوری طرح واضح ہو سکتی ہیں' اللہ کی ذات و صفات کے احاطہ کی نوعیت کیا ہو گی؟ اس کی کوئی حد و انتہا ہو گی یا نہیں؟ اور کیا اس کی ذات و صفات کا احاطہ ممکن ہونے کا مطلب اس کا محدود و محصور ہونا نہیں ہے؟

جواب: سب سے پہلے یہ واضح ہو جانا چاہئے کہ اللہ تعالی کی مکمل معرفت' اس کی شان کا احاطہ اور اس کی کنہ تک پہونچنا خود اللہ تعالی کے سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہے اور اس بات کو بعید از حقیقت نہ سمجھنا چاہیے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک فرشتہ کی حقیقی معرفت خود فرشتہ ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ نبی کی معرفت حقیقی صرف نبی ہی کو ہو سکتی ہے' اس طرح ایک عالم کی مکمل معرفت بھی خود اس عالم ہی کو حاصل ہو سکتی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں

کہ شاگرد جب تک علوم میں استاد کے برابر مرتبہ تک نہ پہونچ جائے وہ اپنے استاد کی مکمل معرفت حاصل نہیں کر سکتا' جب وہ خود علم کے اس مرتبہ پر پہونچ جائے گا تو اس کو قریب قریب استاد کی وہی معرفت حاصل ہو جائے گی جو خود استاد کو اپنی ذات کے بارے میں حاصل ہے۔ چنانچہ پہلے شاگرد ان امور کا علم حاصل کرے گا جو استاد جانتا ہے پھر وہ شاگرد اپنی اس علمی حیثیت کا ادراک کرے گا اور پھر اپنے اوپر قیاس کر کے اپنے استاد کے مقام کو پہچان لے گا اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ استاد کو بھی وہی معلومات حاصل ہیں جو خود اس کو ہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ جس کیفیت کو مجامع اس عمل کے دوران محسوس کرتا ہے اس کو نامرد مکمل طور پر محسوس نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس حالت اور کیفیت کو پورے طور پر سمجھنا اور محسوس کرنا ذوق اور ادراک ہی سے ہو سکتا ہے (اور یہ اس شخص کے بس میں نہیں جو ان اوصاف کا حامل نہ ہو) لہٰذا متعلقہ اوصاف سے متصف ہوئے کسی شئے کی ماہیت معلوم کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا' اس (نامرد) کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے امر کے وجود و اثبات کی نظری تصدیق کر دے جس کی ماہیت اور حقیقت سے وہ نابلد ہے۔

انسان کیسے یہ طمع کر سکتا ہے کہ اللہ کی مکمل معرفت حاصل کر لے جب کہ اس کو خود اپنی بھی مکمل معرفت حاصل نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو اکثر حالتوں میں محض افعال اور اوصاف سے پہچان پاتا ہے اور ان کی ماہیت تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ آدمی اگر چاہے کہ وہ چیونٹی یا کھٹمل کا مکمل علم و ادراک جو اس کے اوصاف کے حقائق کو محیط ہو حاصل کر لے تو وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنی قوت باصرہ کی مدد سے اس کی ظاہری شکل و ہیئت' اس کا رنگ' اس کے اعضاء و جوارح کی ساخت اور ان کا باہمی فرق محض سطحی طور پر معلوم کر سکتا ہے۔ باقی اس کی وہ تمام امتیازی خصوصیات کہ جن کی بناء پر کھٹمل کا وجود چیونٹی کے وجود سے مختلف اور الگ ہے اور جس اختلاف کی وجہ سے ان کی ترکیب اور صفات جدا ہیں' ان کی معرفت حاصل کر لینا ناممکن ہے۔ ہاں اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل و نظیر ہوتا تو اس صورت

میں یہ ممکن تھا کہ وہ مثیل و نظیر اللہ کی ذات کی حقیقی معرفت اپنے اوپر قیاس کر کے حاصل کر لیتا' چنانچہ وہ پہلے اپنی ذات اور صفات کو پہچانتا پھر دوسری ذات کو اس پر قیاس کر لیتا جیسے ایک عالم اپنے آپ پر اپنے جیسے دوسرے عالم کو قیاس کر کے پہچان لیتا ہے۔

بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ آدمی کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں ۔ پہلی حالت میں وہ جنین ہوتا ہے' دوسری حالت میں وہ بچہ ہوتا ہے' تیسری حالت میں وہ سیانا ہوتا ہے' چوتھی حالت میں وہ عاقل ہوتا ہے اور پھر ولی اللہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جنین اپنے آپ کا حال جانتا ہے اور اس کے لئے بچے کا حال جاننا ممکن نہیں اور نہ بچہ سیانے کا حال جان سکتا ہے اور نہ سیانا اپنی مخصوص کی حالت میں عاقل کی حالت کو جان سکتا ہے اور نہ ہی عاقل جو مکمل سمجھ بوجھ رکھتا ہو محض عقل کی نظر سے کام لے کر کسی صاحب کشف ولی کو بغیر استدلال کے جان سکتا ہے' اور اسی طرح نہ کوئی ولی نبی کی حالت کو جان سکتا ہے۔ اس لئے کہ نبوت کا مرتبہ ولایت کے مرتبہ سے بالا تر ہے' نہ نبی فرشتہ کی اتنی معرفت حاصل کر سکتا ہے جتنی خود فرشتہ کو اپنی معرفت حاصل ہے' اور نہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی اتنی معرفت حاصل کر سکتا ہے جتنی معرفت خود اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کی حاصل ہے۔ تو یہ درجہ بدرجہ کمالات اور صلاحیتیں ہیں اور ہر درجہ اور مقام سے محروم شخص جس سے وہ مقام پوشیدہ ہو اس کے بارے میں لاعلم و ناشناس ہے اور اس کی حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ صرف اپنی ہی اصل کے بارے میں برہان قائم کر سکتا ہے۔

جب یہ سب معلوم ہو گیا تو اب یہ جان لینا چاہئے کہ انسانوں کے علم کا منتہا صرف یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب دنیا جو حیرت انگیز طور پر منظم اور مرتب ہے ایک جیتے جاگتے صاحب علم و قدرت چلانے والے مدبر کی محتاج ہے جو نہ خود دنیا میں کسی سے مشابہ ہے اور نہ پوری کائنات اس سے ۔ اس طرح یہ کائنات بظاہر ایک ایسی شئے کے اثبات پر دلالت کرے گی جس سے یہ وجود میں آئی ہے' یہ اللہ کے فعل کی معرفت ہوئی نہ کہ اس کی ذات کی معرفت ۔ اور یہ بالواسطہ معرفت اللہ تعالیٰ کی ذات میں زندگی' علم اور قدرت کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور یہ اوصاف کا علم ہوا نہ کہ حقیقت ذات کا۔ اور اوصاف کی بھی حقیقت کا نہیں بلکہ اپنے نفس پر قیاس کرنے سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے ۔ چنانچہ اگر خود انسان اس صفت کا حامل نہ ہوتا جس کو وہ علم ' حیات اور قدرت سے تعبیر کرتا ہے تو اس کے لئے ناممکن تھا کہ ان امور کی اصل کو

ثابت کر سکے اور ان پر کسی طرح کے دلائل قائم کر سکے اسی طرح یہ معرفت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ذات باری کے لئے حدوث، جسمیت اور عرضیت محال ہے۔ اور یہ بھی کچھ امور کے ذات باری تعالی میں موجود نہ ہونے کا علم ہوا نہ کہ اس کی حقیقت ذات کا۔

ان سب باتوں کا ماحصل یہی علم ہے کہ کائنات ایک بنانے والے کی محتاج ہے نہ کہ اس کی حقیقت ذات کا علم اور ان معلومات کے حاصل کر لینے کے بعد عارف کو ایک خاص طریقہ پر جو خاصا تفصیلی ہے غور کرنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ مخلوق (انسانوں) کے لئے ذات باری کی تہہ تک پہنچنا محال ہے اور یہ عارفین کا آخری درجہ ہے اور اس مرحلہ پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادراک حاصل کرنے سے عاجز ہونا ہی اصل ادراک ہے (العجز عن درک الادراک ادراک) یعنی جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ جل جلالہ کی حقیقت کے ادراک کی کوئی سبیل نہیں اور وہ اس سے عاجز ہے تو اس نے انتہائے کمال کا درجہ حاصل کر لیا اور یہی انسان کے علم کی تکمیل ہے۔ اس موقع پر کوئی عارف اگر یہ کہے کہ میں اللہ کو نہیں پہچانتا تو اس نے ایک طرح سے سچ کہا اور اگر وہ یہ کہے کہ میں اس کو پہچانتا ہوں تو بھی وہ سچا ہوگا۔ اس کی مثال ایک مربوط و مرتب خط کی ہے، جب کسی سے پوچھا جائے کہ "کیا تم اس کے لکھنے والے کو پہچانتے ہو"؟ اور وہ کہے کہ "نہیں"، پھر اس سے کہا جائے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اس کا راقم زندہ عالم وجود میں ہے، صاحب قدرت ہے، سماعت اور بصارت رکھتا ہے اس لئے کہ کتابت ان اوصاف کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس کا لکھنے والا جماد، نبات یا بہیمہ ہو سکتا ہے تو وہ اثبات میں جواب دے گا اور کہے گا کہ میں نے اگرچہ ان سب امور کو اس کے متعلقات و لوازم سے جانا ہے لیکن میں خود اس کو نہیں پہچانتا۔

اسی لئے عارف کو دو حالتیں درپیش ہوتی ہیں: پہلی حالت میں وہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا، دوسری حالت میں وہ کہتا ہے کہ میں اللہ کے علاوہ کچھ نہیں جانتا اور یہ دونوں باتیں دونوں حالتوں میں سچ ہیں۔ پہلی حالت میں جب وہ ذات باری تعالی کے خصائص پر غور و خوض کرتا ہے اور اپنے دل کو اس سمت میں متوجہ کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو حیرت و استعجاب کے عالم میں پاتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں اس کو نہیں پہچانتا۔ دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ذات باری تعالی کے افعال و آثار کو اس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ اس کے افعال ہیں

تو اس وقت وہ اللہ اور اس کی کارفرمائی کے ماسوا عالم وجود میں کچھ نہیں پاتا اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی شئے کو نہیں پہچانتا اور اس کے علاوہ کوئی شئے وجود میں نہیں' وہی یقینی طور پر سب کچھ ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی سورج اور عالم ارضی میں اس کی پھیلی ہوئی روشنی کو دیکھے گا اور اس کی روشنی میں چمکتی ہوئی چیزوں کا مشاہدہ کرے گا اس حیثیت سے نہیں کہ وہ چیزیں بہائم یا جمادات ہیں تو گویا وہ سورج کے علاوہ کچھ نہیں دیکھ رہا ہے۔ تو ایسی حالت میں جب کہ عارف پر انوار الہیہ کثرت سے نازل ہوتے ہیں تو وہ بسط کی کیفیت میں ہوتا ہے اور یہ سب انوار اس پر ذات کے روشن نہیں ہوتے بلکہ آثار ذات کے ہوتے ہیں۔

پہلی حالت قبض کی حالت ہوتی ہے' اسی لئے سید العارفین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تفکروا فی خلق اللہ ولا تتفکروا فی ذات اللہ" (☆)

یہ ایسی حدیث ہے کہ جس میں دیکھنے والے کی نظر بہت دور تک جا سکتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایک عارف معرفت کے ان سمندروں سے جو اللہ تعالی نے اس پر بہائے ہیں پوری طرح فیضیاب ہو ہی نہیں سکتا چاہے اس نے نوح کی عمر ہی کیوں نہ پائی ہو۔ اور عارفوں کی ساری معرفت کی نسبت اللہ تعالی کی معرفت سے اتنی ہی ہے جتنی ایک قطرہ کو دنیا کے تمام سمندروں سے' بلکہ عارفین کی معرفت کی نسبت اللہ کی معرفت سے تو ایک متناہی اور محدود چیز کی لا متناہی اور غیر محدود چیز کی طرف ہے اور قطرہ کی نسبت سمندر سے ایک محدود و متناہی شئے کی ایک اور محدود و متناہی چیز کی طرف ہے لیکن اسی قدر مثال شبہ رفع کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہ شبہ اس ظن پر قائم ہوا کہ انسان اللہ تعالی کی حقیقت ذات کا احاطہ کر سکتا ہے پھر اس ظن پر استبعادات قائم کر لئے' اصل طریقہ اور بناء ہی غلط ہے۔ پھر جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا تو یہ استبعاد رفع ہو گیا۔

(☆) یہ حدیث عموماً صوفیاء کے ہاں ذکر کی جاتی ہے مگر احادیث کے مشہور اور مستند مجموعوں میں اس کو تلاش نہیں کیا جا سکا۔ البتہ مندرجہ ذیل مجموعہ میں یہ الف بائی ترتیب سے درج ہے:

"کشف الخفاء و مزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس" مرتبہ شیخ اسماعیل بن محمد العجلونی (المتوفی ۱۱۶۳ھ)۔ مطبوعہ مکتبۃ القدسی القاھرۃ۔ مصر ۱۳۵۱ھ۔ (مترجم)

واللہ اعلم بالصواب وھو ولی الکفایۃ و التوفیق

سوال نمبر ۲: حجۃ الاسلامؒ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو یہ کہتا ہو کہ:

"اللہ تعالی کی معرفت حاصل کرنا بالاتفاق واجب ہے۔ جب اس کا وجوب ثابت ہوا تو اس کو عقل پہچنوائے گی یا رسول؟' اگر یہ کہا جائے کہ اس کی مدرک (ادراک حاصل کرنے کا وسیلہ) عقل ہے تو رسول کے بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مدرک رسولؐ کا قول ہے اور اس میں عقل کا کوئی دخل نہیں تو یہ تو ان باطنیوں کا مذہب ہوا جو تعلیم کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ رسول یا اس کے نائب کا قول ہے' پھر یہ کہ جب رسول معصوم ہے تو اس کا نائب بھی معصوم ہوا؟

جواب: معرفت محض عقل سے بھی ہو سکتی ہے اور محض تعلیم سے بھی حاصل ہو سکتی ہے' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ تعلیم سے ہو کچھ عقل سے' یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں سے مجموعی طور پر حاصل ہو۔ تو یہ چار مذکورہ صورتیں ہوئیں جو کہ ممکن ہیں۔ تو جس شخص نے سوال کو دو صورتوں میں حصر کیا ہے اس کی حماقت ظاہر ہے اور وہ ایسا ہی جاہل ہے جیسے وہ شخص جو یہ پوچھے کہ "یہ ہندسہ اس ہندسہ سے زیادہ ہے یا نہیں؟" تو یہ سوال غلط سمجھا جائے گا اس لئے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہندسہ نہ کم ہو نہ زیادہ بلکہ مساوی ہو' لہٰذا جو سوال تمام ممکنہ صورتوں پر مشتمل نہ ہو وہ غلط ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کہے کہ "اشیاء یا آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں یا سورج کی روشنی سے اور یا چراغ کی روشنی سے' پس اگر آنکھ سے اشیاء دیکھی جاتی ہیں تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ رات کو ایک اندھیرے مکان میں بھی سب کچھ نظر آ جایا کرے' اگر سورج سے دیکھی جاتی ہیں تو دن کے وقت اندھے کو بھی نظر آنا چاہیئے اور اگر چراغ کی روشنی سے اشیاء دیکھی جاتی ہیں تو ضروری ہے کہ دن کو کچھ دکھائی نہ دے" تو اس سے کہا جائے گا کہ کیسی حماقت کی بات ہے: تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہاری تقسیم صحیح اور جامع ہے اور تم نے اس بات کا انکار کس بنیاد پر کر دیا کہ جو چیز صحیح آنکھ سے سورج یا چراغ کی روشنی میں دیکھی جا سکتی ہے تو وہ روشنی اور صحت

مند آنکھ کے مجموعہ سے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

اسی طرح جو کوئی یہ کہے کہ معرفت یا تعلیم سے حاصل ہو گی یا عقل سے تو وہ غلطی پر ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کچھ معرفت محض عقل سے، کچھ معرفت محض تعلیم سے، اور کچھ دونوں سے بیک وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ پس جو کچھ عقل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے اس کی مثال ہمارا یہ علم ہے کہ ایک موجود قدیم کا ہونا ضروری ہے یعنی ایک ایسی ذات کا وجود ضروری ہے جس پر حدوث محال ہو اور جو زمان و مکان کی قیود سے بالا ہو اس لئے کہ موجودات میں اگر سب کچھ حادث ہو تو وہ بغیر کسی سبب حدوث کے حادث کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارا یہ علم شریعت کے آنے سے پہلے کا ہے، تو اس میں رسول کے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی مثال ہمارا یہ علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ آپ کے سچے ہونے کی دلیل ہے اور ہم نے عقل کی نظر سے یہ جان لیا ہے کہ آپ کی سچائی میں شک کرنا محال ہے پھر ہم نے آپ کی سچائی آپ کے قول اور اس تعلیم سے بھی معلوم کر لی کہ آپ نے فرمایا کہ "جان لو کہ میں سچا ہوں" (اعلموا انی صادق) اور صرف یہی بات شک کو زائل نہیں کرتی بلکہ شک تو اس طویل اور گہری عقل کی نظر سے زائل ہو گا جو ہم آپ کے معجزہ پر ڈال کر اسے سحر، شعبدہ بازی اور تلبیس سے ممیز کریں گے اور یہ سب کام محض عقل سے ہو گا۔ ہاں یہ بھی بعید نہیں کہ اس جانچ کا طریقہ ریاضی اور علم ہندسہ کے ذریعہ کسی استاد کی مدد سے معلوم کیا جائے۔

اور وہ باتیں جو ہمیں محض نبی کی تعلیم سے معلوم ہوئی ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے فرض عبادات کی مقدار کا علم، نمازوں کی رکعات کی تعداد کا علم، زکوۃ کے نصاب کا علم اور اسی طرح باقی شروط عبادات کی تفصیل، آخرت، جنت، دوزخ، حساب، کتاب اور میزان وغیرہ سے متعلق باتیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کے اصول و تفصیلات اور امور آخرت کی شروح و توضیحات کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔

باقی رہا اس بات کا جاننا کہ "یہ کائنات ایک ایسے بنانے والے کی محتاج اور دست نگر ہے جو رسول بھیجنے پر قادر ہو"، جب یہ علم قول رسول پر مقدم ہے، تو پھر یہ قول رسول سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ہم سے آ کر کہے کہ میں شیطان کا فرستادہ ہوں تو ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس لئے کہ ہم شیطان کو نہیں جانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ وہ موجود ہے یا

معدوم ۔ پس اگر ہم اللہ سبحانہ تعالیٰ کو نہ جانتے تو اللہ کا تصور ہمارے لئے نامعلوم ہوتا اور رسول کا یہ قول کہ "میں رسول اللہ ہوں"، ایک نہ سمجھ میں آنے والی بات ہوتی ۔ لہٰذا جب بھیجنے والے کو پہچاننا رسول کو پہچاننے اور اس کی سچائی کو جاننے پر مقدم ہے تو یہ بات (اللہ کی معرفت) قول رسول سے کیسے معلوم ہو سکتی ہے؟ اور وہ باتیں جو عقل اور تعلیم دونوں سے معلوم ہوتی ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے رؤیت باری اور اللہ تعالیٰ کا خالق افعال العباد ہونا، یہ باتیں ان امور میں سے ہیں جو عقل و تعلیم دونوں سے ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔

اب کسی عاقل کا، اگر وہ کوئی چیز چراغ کی روشنی میں دیکھ لے، یہ کہنا کہ سورج بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ بھی ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ عقل کی موجودگی میں شریعت نازل کرنے اور رسول بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ درحقیقت شریعت روشنی دینے میں سورج کی مانند ہے، اس سے بھی ایسے ہی فائدہ اٹھایا جاتا ہے جیسے عقل سے جو کہ چراغ کی طرح ہے لیکن سورج کے ہوتے ہوئے بھی چراغ افادیت سے خالی نہیں۔

اور ان کا یہ کہنا کہ "جب تم کہتے ہو کہ کچھ ہم نے قول رسول سے معلوم کیا ہے تو تم عین ہمارے مذہب پر آ گئے ہو اس لئے کہ رسول معصوم تھے، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ کچھ باتیں ہم امام معصوم کے قول سے معلوم کرتے ہیں تو تم ہمارے ساتھ متفق ہوئے"۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی تم سے کہے کہ "اگر تم کہو کے "لا الہ الا اللہ عیسیٰ رسول اللہ" تو تم عیسائیوں سے متفق ہو گئے اس لئے کہ یہ ان کا مذہب ہے "تو اس بات کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ یہ ان کی انتہائی حماقت ہے اس لئے کہ یہ کلمہ کہنے والا شخص نصاری کا ہر اس بات میں مخالف نہیں جو وہ کہتے ہیں بلکہ ان کی باتوں میں سے جو کچھ باطل و بے بنیاد ہے اس کا مخالف ہے۔ اور ہر ملحد و کافر کے لیے ممکن ہے کہ وہ کوئی حق بات کہہ دے جسکا وہ منکر نہیں ہے۔ چنانچہ ان کا یہ کہنا کہ " نبی کی تعلیم سے وہ علوم حاصل ہوتے ہیں جن میں عقل کا کوئی دخل نہیں" (یا جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی) صحیح اور سچ ہے اور ہم ان کے اس قول کا انکار نہیں کرتے لیکن ہم ان کے ایسے شخص کے بارے میں دعوائے عصمت کو نہیں مانتے جو نہ نبی ہو، نہ صاحب معجزہ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ نبی کے بعد خطا کا صدور ہر ایک سے ہو سکتا ہے۔

اور ان کا یہ کہنا کہ رسول معصوم تھے الخ تو یہ بھی ایسی جہالت ہے جیسے کوئی کہے کہ

رسول نبی تھے جن کی طرف جبریل اترتے تھے اس لئے چاہئے کہ ان کا نائب بھی ایسا ہی نبی ہو اور اسی طرح جیسے کوئی کہے کہ سلطان کسی کا نائب نہیں تو چاہئے کہ اس کا وزیر بھی کسی کا نائب نہ ہو اور (اسی طرح) اگر کوئی کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکی تھے گندمی رنگ کے تو چاہئے کہ ان کا نائب بھی ایسا ہو وغیرہ۔ یہ ساری جہالتیں ایسی ہیں کہ ان سے پاگل بھی دھوکہ نہیں کھاسکتے لن کے جواب مین یہی کہا جائے گا کہ نبی معصوم تھے اور خود اپنی جگہ پہ اصل تھے تو پھر ان کے نائب کو معصوم نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ اگر وہ بھی معصوم قرار دیا جائے تو پھر دونوں میں فرق کیا رہا؟ وہ خود ہی نبی اوز اپنی جگہ پر خود اصل ہو جائے گا' نائب کہاں رہے گا؟ گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ چاہئے کہ وہ نائب نہ ہو' اس لئے کہ جب وہ معصوم ہو گا اور وحی اس پر آتی ہو گی اور کسی رسول سے خبر سنے اور روایت کئے بغیر براہ راست اللہ تعالی کی طرف سے حقائق معلوم کرے گا تو وہ نائب کیوں ہو گا؟ نبی نہیں ہو جائے گا؟ اور اگر یہ ہو سکتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موسی اور عیسی علیہما السلام کی طرف سے نائب ہوں مگر وہ (حضور) بھی معصوم ہیں اور جن امور کی بابت کسی کے پاس کوئی روایت یا خبر نہیں ان کے بارے میں وہ اللہ تعالی کی جانب سے براہ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔

مجھے یہ بتائیے جب انکا امام معصوم ہر اس بات میں جو اس سے پوچھی جائے عقل' نظر' وحی اور اخبار النبی کی طرف رجوع کر کے حقیقت معلوم کر لیتا ہے تو اگر وہ وحی کے ذریعہ معلوم کرتا ہے تو اس میں اور نبی میں کیا فرق رہا کہ وہ نائب ہو؟ اور اگر وہ عقل سے معلوم کرتا ہے تو اس کی عقل پر بھروسہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اور عقل سے اشیاء کا ادراک ہوتا ہی کہاں ہے؟ اور اگر وہ اخبار ماثورہ کی طرف رجوع کر کے معلوم کرتا ہے تو دوسروں کے کان کس نے بند کر رکھے ہیں کہ وہی احادیث سن لے دوسرا کوئی نہ سنے؟۔

سوال نمبر۳: سیدنا حجۃ الاسلامؒ ان پانچ سوالات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اسلام کے باغی گروہ نے' جو ملک میں فتنہ و فساد برپا کئے ہوئے ہیں' مسلمانوں سے کر کے انہیں خبط کر دیا ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن میں جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور یہ ہر کمزور رائے رکھنے والے کو ڈانوا ڈول کیے دے رہے ہیں:

(ا) کیا اہل اسلام اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ باری تعالی ہر شیئے سے غنی

اور بے نیاز ہے اور کسی شئے کا وہ محتاج نہیں اور وہ اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس بے نیازی کے باوجود اس نے عبادت کا مکلف کیا اور اس کا حکم دیا۔ کیا آپ عقلی دلیل سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ جو ہر شئے سے غنی ہو وہ اس کو جس کا وہ محتاج نہیں ایسے کام کا مکلف کرے جس سے وہ بے نیاز ہو؟ آپ یہ ثابت کریں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ شاید میں بھی جان جاؤں

(ب) اللہ تعالیٰ نے بندوں کو عبادت کا مکلف کیا اور انہیں معصیت سے منع کیا تاکہ مطیع کو ثواب اور عاصی کو عقاب دیا جائے اور عقلیات میں یہ بات بالکل محال ہے اللہ کو اپنی مخلوق کو سزا دینے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ انہیں ایسے کام کا مکلف بناتا ہے جس کے نہ کرنے پر انہیں سزا ملے، اگر اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تو پھر یہ بالکل مستحیل ہے، اس کے اندر کوئی حکمت یا موجب حکمت امر نہیں اور اگر اس کو یہ کام کرنے کی کوئی ضرورت ہے تو اس کو حکم دے کر مکلف بنانے کی کیا ضرورت ہے وہ بغیر ہی تکلیف کے اس پر قادر ہے کہ جسے چاہے سزا دے اور جسکو چاہے جزاء، تو پھر تکلیف ایک غیر ضروری اور زائد بات ہوئی جس میں کوئی حکمت کار فرما نہیں اور محتاج ہونا ایک کمی اور نقص ہے اور اللہ کی طرف نقص منسوب نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ وہ غنی اور غیر محتاج ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اطاعت کا حکم دیا تاکہ وہ انہیں اس سے فائدہ پہنچائے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ اس سے عاجز تھا کہ انہیں مکلف کیے بغیر فائدہ پہنچا دیتا کہ اس کو انہیں مکلف کرنے کی ضرورت پیش آئی تب انہیں فائدہ پہنچایا۔ اگر اس کی غرض فائدہ ہی پہنچانا ہے تو تکلیف بے کار ثابت ہوئی اور اگر وہ تکلیف کے بغیر نفع پہنچانے سے عاجز ہے تو قدرت خداوندی باقی نہ رہی اور اس کا عجز ثابت ہوا جو کہ محال ہے۔

(د) وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں" (القرآن - ۲۱:۲۳) یہاں عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔ کیا یہ ہو سکتا

ہے کہ کوئی حکیم و دانا کسی ایسے کام کا حکم دے جو حکمت سے خالی ہو اور عقل بھی اسے قبول نہ کرتی ہو پھر وہ عاقل کو اس کی چھان بین اور تحقیق سے بھی روک دے، کیا یہ ظلم و تعدی کی کوئی قسم نہیں ہے؟ پھر عقل کے عاقل کے لئے حجت و راہنما ہونے کے کیا معنی رہ گئے اور اس پر امرو نہی مرتب کرنے (اوامر و نواہی عائد کرنے)، اس کے لئے حیوانات کو مسخر کرنے اور اس کی حیوانات سے کام لینے کے مختلف طریقوں کی طرف رہنمائی کرنے اور اس پر مختلف پابندیاں عائد کر کے اور مختلف کاموں کا مکلف بنا کر اس کو ان کے بارے میں تحقیق و تفتیش اور ان کا سبب اور علت معلوم کرنے سے روک دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ پھر علماء یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی وہی عمل قبول کرتا ہے جس کا کرنے والا سوچ سمجھ کر اس عمل کو کرے اور سوچ سمجھ تحقیق و تفتیش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وحی کا راستہ تو اس پر بند ہے۔ پھر تحقیق و تفتیش کے بغیر سوچ سمجھ بھی حاصل نہ ہوگی تو عمل بھی قبول نہ ہو گا اور یہ بات اس کے خلاف جاتی ہے جو علماء کہتے رہے ہیں اور جس کی انبیاء خبر دیتے رہے ہیں۔

پھر ہم نے اللہ تعالی کی کتاب میں ایک جگہ اس کا یہ قول دیکھا" وہ اپنے کاموں کے لئے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں "یہاں اللہ تعالی نے سوال کی گنجائش نہیں رکھی، ایک دوسری جگہ میں اس کا موقع فراہم کر دیا اور وہ اللہ تعالی کا یہ قول ہے:" اور ہم اس کو قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا، "پروردگار دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ اللہ تعالی فرمائے گا "ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں تو نے بھلا دیا تھا، اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے (القرآن ۔ ۲۰: ۱۲۶۔ ۱۲۴)" اب اس سے زیادہ مکمل سوال کیا ہوگا جو اس جواب کا متقاضی ہوا؟ اور قرآن میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں اور اس طرح کی آیات میں تناقض ظاہراً موجود ہے۔ اور اس کا ایسا شافی جواب دینا جسکو عقل قبول کرلے ضروری ہے"۔

جواب : پہلا سوال اور وہ استغناء ہونے کے باوجود مکلف بنانے کو غلط (بعید از حق) سمجھنا اور ان دونوں کے درمیان تناقض کا وہم دراصل حقیقت تکلیف سے لاعلمی کی پیداوار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا:

" من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعليها" (۴۶:۴۱) اور "۰۰۰ فلا نفسهم يمهدون (۳۰:۴۴)"
"جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لئے اچھا کرے گا اور جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا" اور "وہ اپنی راہ خود اپنے ہی لیے سنوارتے ہیں"۔

سوال کرنے والا شاید یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا مکلف بنانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان اپنے غلام کو مکلف بنائے: مگر انسان تو اپنے غلام کو ان اعمال کا مکلف بناتا ہے جن سے اس کی اپنی کوئی غرض وابستہ ہو اور جس کام میں اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور جس کی خود اسے ضرورت نہ ہو اس کا مکلف وہ غلام کو نہیں بناتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سائل نے اپنے ذہن میں ایک غلط قیاس قائم کر رکھا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے مکلف بنانے کا بندہ کے مکلف بنانے سے تقابل کرنا ایک باطل خیال ہے اللہ تعالیٰ اس قسم کے خیالات اور احتمالات سے برتر ہے۔ اس سوال کا غلط ہونا تکلیف کی حقیقت واضح کر دینے سے ظاہر ہو جائے گا اور یہ امر ذرا تفصیل طلب ہے۔ جو کوئی بھی علوم کے حقائق کو اپنی کمزور رائے، ضعیف عقل اور فاسد قیاس کے بل بوتہ پر حاصل کرنا چاہے گا وہ گمراہیوں میں ہی بھٹکتا رہ جائے گا۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ علمی حقیقتیں اہل علم سے معلوم کی جائیں اور ان ٹھوس رائے رکھنے والے علماء سے دریافت کی جائیں جو عقلی حقائق پر بھی دسترس رکھتے ہوں اور شریعت کے اسرار سے بھی واقف ہوں، جو ادلۃ اور براہین کی شرائط سے آگاہ ہونے کے ساتھ ان مقامات پر بھی نگاہ رکھتے ہوں جہاں سے شکوک و شبہات نفوذ کر جاتے ہیں۔

یہ سوالات کمزور ذہن اور بیمار سوچ کی پیداوار ہیں، بہرحال ان کمزور سوالات پر ہی مندرجہ ذیل وضاحت کی جاتی ہے۔ چونکہ کمزور اذہان کا بہترین علاج مثالیں دے کر سمجھانا ہے تو ہم دو مثالیں دینے پر اکتفا کرتے ہیں:

پہلی مثال تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مکلف بنانا ایسے ہی ہے جیسے ایک طبیب مریض کو مکلف بناتا ہے: جب اس پر حرارت غالب آتی ہے تو وہ اس کو مبردات پینے کا حکم دیتا ہے جب کہ طبیب خود اس کے پینے سے بے نیاز ہے، نہ تو مریض کی مخالفت سے طبیب کو کوئی نقصان پہنچتا

ہے نہ ہی اس کی موافقت سے لیکن نفع و ضرر خود مریض ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ طبیب صرف راہنما اور ہدایت دینے والا ہے: اگر مریض طبیب کا کہا مانتا ہے تو وہ شفاء پا کر بیماری سے چھوٹ جائے گا اور اگر وہ طبیب کی موافقت نہیں کرتا تو مرض شدت اختیار کرے گا اور وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اس کا مرنا اور جینا طبیب کے لئے برابر ہے اس لئے کہ وہ اس کی بقاء و فناء سے بے نیاز ہے' پس جسطرح اللہ تعالی نے بقاء و فناء کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں جن کو اطباء پہچانتے ہیں اسی طرح سعادت آخرت کے لئے بھی اسباب مقرر کئے ہیں اور وہ اسباب اس سعادت کا اسی طرح موجب ہیں جیسے دواء شفاء کی موجب ہے' اور وہ اسباب جو سعادت اخروی کا موجب ہیں: اطاعت خداوندی' اور نفس کو مجاہدہ کے ذریعہ خواہشات نفسانیہ اور رذائل اخلاق سے پاک رکھنا ہیں اس لیئے کہ یہ دونوں باتیں مرض میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔ گناہ آخرت کی زندگی کے لئے اسی طرح مہلک ہیں جیسے زہر دنیاوی زندگی کے لئے۔ جسطرح جسموں کے لئے طب ہے اسی طرح نفوس کے لئے بھی طریق علاج موجود ہے اور انبیاء نفوس کے طبیب ہیں جو انسانوں کو کامیابی کی راہ دلوں کی صفائی کے طریقوں کو منضبط کر کے دکھا دیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے " قد افلح من زکاھا ہ قد خاب من دساھا "جس نے اپنے نفس کو سنوار لیا اس نے مراد پالی اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ نامراد ہوا"۔ (۹۱:۱۰-۹) پھر یہ کہا جاتا ہے کہ طبیب نے مریض کو فلاں کام کا حکم دیا اور فلاں کام سے منع کیا' یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا مرض اس لئے بڑھ گیا کہ اس نے طبیب کا کہا نہیں مانا' اور اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مریض اچھا ہو گیا اس لئے کہ اس نے طبیب کے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی اور پرہیز میں کوتاہی نہیں کی' درحقیقت مریض کا مرض صرف اس وجہ سے نہیں بڑھتا کہ اس نے اس طبیب شخص کی مخالفت کی بلکہ اس لئے کہ وہ طبیب کے بتلائے ہوئے طریقہ صحت پر نہیں چلا' اسی طرح نفوس کا پرہیز قلوب کے امراض کو دور کر دیتا ہے اور قلوب کے امراض آخرت کی زندگی کو ایسے ہی تباہ کر دیتے ہیں جس طرح کہ جسمانی امراض دنیاوی زندگی کو فنا کر دیتے ہیں۔

دوسری مثال یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی بادشاہ دربار سے غیر حاضر اپنے کسی غلام کے پاس سواری اور مال و دولت روانہ کر کے اسے دربار میں بلا بھیجتا ہے کبھی تو اس لئے کہ بادشاہ اس سے کوئی کام لے اور سلطنت کا کاروبار اور حکومت کا نظم چلانے میں اس سے مدد لے (یہ

صورت اور اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کی مثال ناممکن ہے) اور کبھی بادشاہ اس لئے بلاتا ہے کہ غلام بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ کا قرب حاصل کرے اور اس مرتبہ سے بہرہ مند ہو باوجودیکہ بادشاہ اس کی مدد سے مستغنی اور اس سے کام نہ لینے کا تہیہ کئے ہوئے ہے مگر اس کو اپنے سے قربت' محض غلام کے فائدہ اور اس کی سعادت کے پیش نظراور اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کی خاطر' بخشتا ہے۔ پس اب اگر وہ غلام بادشاہ کی بھیجی ہوئی سواری ضائع کر دے اور مال خرچ کر ڈالے اور اپنے آقا تک پہنچنے میں اسے صرف نہ کرے تو وہ ناشکرا اور نمک حرام سمجھا جائے گا لیکن اگر وہ بادشاہ کی عطا کردہ سواری پر سوار ہو کر منزل کی طرف گامزن ہو جائے اور اس مال کو زادراہ میں خرچ کرے تو وہ شکر گزار نعمت سمجھا جائے گا۔ اگر اس غلام نے آقا کے ارادہ کے علی الرغم کیا تو یہ رویہ کفران نعمت خیال کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کی جلالت شان اور بے نیازی کے سامنے اس کے بندوں کا کفر و ایمان برابر ہے مگر "وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا" (۳۹:۷) اس لئے کہ کفر بندوں کے شایان شان نہیں ہے اور انہیں بدبختی میں مبتلا کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک بے نیاز بادشاہ اپنے غیر حاضر غلام کی بدبختی' ذلت اور تنگدستی کو برداشت نہیں کر سکتا باوجودیکہ وہ اس بات سے مستغنی ہے کہ غلام اس کے قریب ہو یا دور۔ اسی طرح یہ مکلف بنانے کا معاملہ بھی سمجھ لینا چاہئے۔ پس طاعات ادویہ ہیں اور گناہ زہر ہیں اور دلوں پر ان کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے اور بالآخر صرف وہی فرد نجات پائے گا جو خدا کے حضور قلب سلیم لیکر جائے گا۔ جس طرح کوئی شخص جب تک معتدل مزاج نہ پالے صحت یاب نہیں ہو سکتا اور جس طرح طبیب کا مریض کو یہ کہنا صحیح ہے کہ "میں نے تمہیں تمہارا برا بھلا سمجھا دیا ہے اگر تم نے میری موافقت کی تو اپنے لئے کرو گے اور اگر مخالفت کی تو خود بھگتو گے" اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی صحیح ہے:

من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا"

دوسرا سوال بھی اسی مذکورہ سوال کا ایک حصہ ہے پس یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے مستغنی ہے کہ اپنے بندہ کو اطاعت پر ثواب دے اور اس سے بھی مستغنی ہے کہ اسے کسی کام کا مکلف بنائے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کو کسی معصیت پر بندہ کو سزا دینے کی کیا حاجت ہے؟ جبکہ معصیت عبد سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ اللہ

تعالی حیوان کو پیدا کرنے میں جماع کا حکم دینے سے مستغنی ہے ' بچہ کی پرورش میں ارضاع سے مستغنی' پیاس بجھانے میں پانی سے مستغنی ہے ' پیٹ بھرنے میں کھانے سے مستغنی اور بیمار کو تندرست کرنے میں دواؤں سے مستغنی ہے پھر وہ کیوں اس شخص کو جو کھانا چھوڑ دے بھوک کی سزا دیتا ہے' اس شخص کو جو دواء استعمال کرنی چھوڑ دے بیماری کی سزا دیتا ہے اور جو اپنے بچہ کو دودھ پلانا چھوڑ دے اس کے بچہ کو موت سے دوچار کر دیتا ہے؟

یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالی گناہوں کی سزا غضب اور انتقام سے دیتا ہے' یہ لوگ نہیں جانتے کہ لفظ غضب اور انتقام مستعار اور متاؤل ہے اور اللہ تعالی کا بندوں پر غضب محض ایلام کے ارادہ سے ہے۔ پس جسطرح دنیا میں اسباب اور مسببات ایک دوسرے کے موجب ہیں اور ایک دوسرے پر مسبب الاسباب کی بنائی ہوئی ترتیب کے مطابق منتج ہوتے ہیں تو ان میں سے بعض کلفتوں کا موجب ہوتے ہیں اور بعض راحتوں کا۔ اور اسباب اور ان کے نتائج سے اطباء ہی آگاہ ہوتے ہیں اسی طرح اطاعت اور گناہ گاری کی نسبت آخرت کی تکالیف اور راحتوں سے ہے۔

تیسرا سوال بھی خود بخود حل ہو گیا' اس لئے کہ اللہ تعالی کو اس بناء پر عجز سے موصوف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بغیر کھائے پیٹ کیوں نہیں بھر دیتا یا پیئے بغیر پیاس کیوں نہیں بجھا دیتا اور مباشرت کے بغیر پیدا کیوں نہیں کر دیتا اور دودھ پلائے بغیر پرورش کیوں نہیں کر دیتا۔ لیکن اللہ نے اسباب اور مسببات کی ترتیب ان اسرار اور حکمتوں کی بناء پر قائم کی ہے جن کو اللہ اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اور یہ کوئی ناقابل یقین بات نہیں۔ اس کائنات میں اللہ تعالی کی بنائی ہوئی سوچی سمجھی سکیم کارفرما ہے اور اس کا مرتب کردہ مربوط نظام حیرت انگیز طور پر قائم ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ جو اس حکمت کے راز کو نہ پا سکے اسکو اپنی ہدایت میں کمی اور سمجھ کے قصور کی وجہ سے حیرت کی فراوانی حاصل ہو گی اور وہ استغراب اور الجھاو میں مبتلا ہو جائے گا۔ جیسے کوئی اندھا کسی گھر میں داخل ہو کر گھر کے صحن میں رکھے ہوئے سامان سے ٹکرا جائے اور پھر اہل خانہ سے یہ کہنے لگے کہ "بیوقوفو! تمہاری عقل کو کیا ہوا اس ساز و سامان کو اپنی جگہوں پر کیوں نہیں رکھتے؟ اور انہیں راستہ میں کیوں ڈال رکھا ہے؟ تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ سامان اور برتن تو اپنی جگہ پر ہی دھرے ہیں مگر یہ آپ کی بینائی کا قصور

ہے۔ مختصراً یہ کہ جو شخص تعجب اور برہان محیل کے درمیان فرق کو نہ سمجھ سکے اس کی عقل خبط ہوتی جائے گی اور گمراہی بڑھ جائے گی۔ مسئلہ مذکورہ میں سائل کو صرف تعجب لاحق ہوا ہے۔

اور رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب کو اس طریقہ پر کیوں مرتب و منظم کیا؟ تو اگر کسی اور طریقہ پر کیا ہوتا تو کوئی جاہل اس پر بھی معترض ہو کر کہہ سکتا تھا کہ اس طرح کیوں کیا اس طرح کیوں نہیں کیا؟ ان تعجبات کی جڑ عوام الناس کے توہمات ہیں جب کہ ایک سمجھدار آدمی ان کی طرف توجہ کرنے کی بجائے مقتضائے براہین کو دیکھتا ہے۔

چوتھے سوال کا ماحصل چار غلط فہمیاں ہیں:

پہلی غلط فہمی تو ان کا یہ کہنا ہے "اللہ نے ایک کام کا حکم تو دے دیا مگر اس کے متعلق تفتیش سے منع کر دیا حالانکہ بصیرت تفتیش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی"۔ ان کی یہ غلط فہمی بالکل بے بنیاد ہے اس لئے کہ کسی کام پر عمل پیرا ہونا اس پر پکے اعتقاد کا یا اس کی حقیقی معرفت کا تقاضا کرتا ہے اور پکا اعتقاد خالص تقلید سے ہی حاصل ہوگا اور معرفت برہان سے حاصل ہو گی' اور اس تک تحقیق و تفتیش ہی سے پہنچا جا سکتا ہے مگر تفتیش و تحقیق سے ہر ایک کو منع نہیں کیا گیا۔ صرف ان کمزور اور ناپختہ لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو برہان و تحقیق کی موشگافیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب مریض کے لئے کوئی دوا تجویز کر دے مگر اسے یہ نہ بتائے کہ یہ دوا اس کے لئے کیونکر مفید ہو گی اور ساتھ ہی مریض کو بھی منع کر دے کہ وہ اس کی جستجو میں نہ پڑے اس لئے کہ طبیب کو معلوم ہے کہ اس کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب اگر وہ مریض طبی اسباب و علل کی تحقیق و جستجو میں پڑ گیا تو یہ اس پر شاق گذرے گا اور وہ نہ صرف ان چیزوں کے سمجھنے میں ناکام رہے گا بلکہ الٹا اس کا مرض بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر طبیب نے شاذ و نادر کوئی ایسا ذہین مریض دیکھا جو اس کو نظام طب سے مانوس نظر آیا تو وہ اس کو تحقیق سے نہ صرف یہ کہ منع نہیں کرے گا بلکہ اسے تجویز کردہ دوا کی علت اور اس کے اثرات بھی بتا دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ جب طبیب یہ جان جائے گا کہ اس کا مریض صرف اس کے کہہ دینے سے مطمئن نہ ہوگا اور محض تقلید کے طور پر اس کی تصدیق نہیں کرے گا اور اس میں اتنی ذہانت بھی ہے کہ وہ علت و وجہ کو سمجھ لے اور یہ کہ اگر اس نے سمجھ لیا تو وہ یکسو ہو کر علاج میں مصروف ہو جائے گا اور اگر یہ سب باتیں اسے

معلوم نہ ہوئیں تو محض تقلید پر راضی نہ ہوگا تو طبیب کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی بیماری اور دوا کے درمیان مناسبت سے اسے آگاہ کر دے اگر وہ اس کی بھلائی چاہتا ہے اور جب وہ یہ جانتا ہو کہ مریض باصلاحیت ہے تو اسے تحقیق و جستجو سے بھی نہ روکے۔ مگر بیماریوں میں یہ بہت شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور اکثر لوگ اس سے قاصر ہی ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شرعیات میں علل' اسرار اور ان کی تحقیق کا معاملہ بھی ہے۔

دوسری غلط فہمی جانوروں کو انسانوں کے لئے مسخر کرنے کے بارے میں' ایسے ہی ہے جیسے کوئی اس بات پر تعجب کرے کہ جب کوئی شخص چند قدم چل کر کسی تفریح گاہ تک جاتا ہے یا حسین مناظر دیکھنے جاتا ہے تو اس نے اپنا پیر کیوں تھکایا؟ اور محض آنکھ کی لذت کی خاطر اپنے پیروں کو مسخر کر دیا حالانکہ آنکھ بھی اس کا ایک آلہ ہے جیسے پیر اس کا ایک آلہ ہے۔ تو اس نے ایک آلہ کو خادم اور دوسرے کو مخدوم کیوں بنایا اور ایک کی راحت و خوشنودی کے لئے دوسرے کو تکلیف دی؟ اس طرح کی غلط فہمی اقدار اور مراتب سے ناواقفیت اور لاعلمی کی بناء پر ہوتی ہے۔ لیکن ایک عقل مند صاحب بصیرت شخص جانتا ہے کہ کمتر کو ہمیشہ برتر پر قربان کیا جا سکتا ہے اور ناقص کو کامل کی خاطر کام میں لایا جا سکتا ہے اور یہ عین حکمت اور دانشمندی کا تقاضا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ یہ ظلم ہے ظلم کی حدود سے ان کی ناواقفیت کا مظہر ہے اس لئے کہ ظلم غیر کی ملکیت میں تصرف کا نام ہے اور اللہ تعالی نے اپنی ملک کسی کے سپرد نہیں کر رکھی کہ اس میں اس کا تصرف ظلم گردانا جائے۔ اس کی جانب سے ظلم کے سرزد ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے اختیار حاصل ہے کہ اپنے ملک میں جو چاہے کرے اور وہ اس میں عادل قرار دیا جائے گا۔

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ "شرع ایسی کسی بات کا حکم کیسے دے سکتی ہے جس کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو" اس بات کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اگر اس سے سائل کی مراد یہ ہے کہ عقلی برہان اس کے ناممکن ہونے پر دلالت کرتی ہو جیسے اللہ تعالی کا اپنے آپ کو پیدا کرنا یا جمع بین الضدین تو اس طرح کے معاملات میں کوئی شرع وارد نہیں ہوئی۔ اور اگر مذکورہ اعتراض سے سائل کی مراد یہ ہے کہ عقل اس حکم شرعی کے ادراک سے قاصر ہو اور اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے تو یہ بات ناممکن اور محال نہیں۔ بلکہ اللہ تعالی کا انبیاء کو بھیجنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ وہ

انسانوں کی ان امور کی طرف رہنمائی کریں جن کو سمجھنے سے ان کی عقلیں قاصر ہیں۔ مثلاً یہ ناممکن نہیں کہ اطباء یہ علم رکھتے ہوں کہ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے یا یہ کہ کوئی حاملہ عورت کسی خاص دانہ پر چلے تو بچہ جن دے گی اور اسی طرح کے دوسرے خواص' ظاہر ہے کہ ان باتوں سے عقل انکار کرتی ہے اس معنی میں کہ نہ تو وہ ان کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے نہ ہی ان کی خبر دے سکتی ہے اس معنی میں نہیں کہ ان کے محال ہونے کا فیصلہ صادر کر دے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جسکا عقل ادراک نہ کر سکے وہ محال نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر ہم نے آگ اور اس کی جلانے کی کیفیت کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہوتا اور کوئی آ کر ہم سے یہ کہتا کہ میں ایک لکڑی کو دوسری لکڑی سے رگڑ کر عدسے کے برابر ایک چیز پیدا کروں گا جو اس شہر کو ہڑپ کر جائے گی اور شہر والوں کو بھی کھا جائے گی یہاں تک کہ کوئی چیز بھی اس سے نہیں بچ سکے گی' اور اس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کہ تباہ ہونے والی اشیاء کو اس چیز کے اندر لایا جائے تب وہ ختم ہو اور نہ اس کی ضرورت پڑے گی کہ ہم اس میں کچھ زیادتی کریں بلکہ وہ خود بخود سارے شہر کو نیست و نابود کر کے خود بھی فنا ہو جائے گی اور نہ یہ شیئے خود باقی رہے گی نہ یہ شہر باقی رہے گا اور ہم یہ کہتے رہتے کہ یہ بات تو عقل کے مطابق نہیں نہ عقل اسے قبول کرتی ہے' مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری عقل نے اس بات کی تصدیق کی اور ہماری آنکھ نے اس حقیقت کا نظارہ کیا۔ اسی طرح شریعت بھی اس قسم کی بعض محیر العقول باتوں پر مشتمل ہے جو محال تو نہیں مگر عقل سے بعید ضرور ہیں اور بعید اور محال کے درمیان بڑا فرق ہے۔ بعید وہ ہے جو مانوس نہ لگے اور محال وہ ہے جسکا وقوع ناممکن ہو۔

چوتھی غلط فہمی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے کیے کا کسی کے آگے جواب دہ نہیں اور دوسرے لوگ ہیں (لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون) مگر پھر اللہ سے جواب طلبی کی گئی اور کہا گیا کہ "تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا" (لم حشرتنی اعمی)، تو اس غلط فہمی کی وجہ اس بات سے ناواقفیت ہے کہ لفظ "سوال" کئی معنوں میں آتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو سوال سے غرض التزام ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ "فلاں نے فلاں سے مناظرہ کیا اور اس پر اس کا سوال عائد ہو گیا" اور کبھی سوال سے مراد استفسار ہوتا ہے جیسے یہ کہا جائے کہ "شاگرد نے استاد سے سوال کیا" تو اللہ تعالیٰ پر سوال بمعنی الزام نہیں کیا جا سکتا اور یہی الزامی سوال اللہ تعالیٰ کے اس قول میں مراد ہے کہ "لا

یسئل عما یفعل الخ" تو اللہ تعالی سے سوال الزاما اور عاجز کرنے کے طور پر نہیں کیا جاتا ہے کہ "کیوں ایسا ہوا" (لم) البتہ جو سوال استفہام اور استفسار کے طور پر کیا جاتا ہے اسی قبیل کا یہ سوال بھی ہے کہ "لم حشرتنی اعمی"۔

ان سوالات کا اسی قدر جواب کافی ہے۔ جو نصیحت میں خاص طور پر سوال کنندہ کو کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنی اور اپنے دین و ایمان کی فکر کرے، تقوی اختیار کرے اور ایسے قابل اور منجھے ہوئے عالم کی تلاش کرے جو شریعت اور عقل دونوں میں درک رکھتا ہو تاکہ وہ اس کو سچائی کا راستہ دکھا سکے۔ جو کوئی معمولی سی شدبد سے ہی اتباع و تقلید سے اونچا ہونا شروع کر دے اور استقلال و اطمنان اور شرح صدر کے درجہ کو حاصل نہ کر سکے وہ تو تباہ ہو گیا۔ ہم اللہ تعالی سے بد فہمی اور کم علمی سے پناہ مانگتے ہیں کہ اس سے تو بے وقوفی اور بھولپن ہی نجات کے زیادہ قریب ہے۔

واللہ ولی الکفایۃ والتوفیق وھو حسبنا و نعم الوکیل والحمدللہ رب العالمین وصلوتہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ الاکرمین واصحابہ المنتخبین۔

قومی ہجری کونسل کی

بچوں کے لئے دلچسپ، معلوماتی اور نصیحت آموز کتابیں

پیام رسولؐ

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی احادیث کا مجموعہ، جن کا تعلق روزمرہ کی زندگی، معاشرت، رہن سہن، معاملات، آداب و اخلاق اور علم و دانش سے ہے، احادیث کے ترجمے میں زبان کی آسانی اور سلاست کا خاص طور پر دھیان رکھا گیا ہے، تاکہ بچے، آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں۔ اردو، پشتو اور بلوچی زبانوں میں دستیاب ہیں۔
صفحات : ۶۸ قیمت : ۲۰ روپے

ہمارے قائد (محمد علی جناح)

بانی پاکستان حضرت قائداعظم کی زندگی کے چیدہ چیدہ ایک سو ایک واقعات، جو حسن عمل کی دلکش تصویر اور نئی نسل کے لئے چراغ راہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اردو، پشتو اور بلوچی میں دستیاب ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔
صفحات : ۱۵۳ قیمت : ۴۰ روپے

اسلامی دنیا

اقبال کے شاہینوں کے لئے اسلامی دنیا کے بارے میں معلومات کا خزانہ، اس میں جہاں نو آزاد مسلمان ممالک کا تذکرہ ملے گا، وہیں ان ممالک سے بھی آگاہی ہوگی جہاں اکثریت تو مسلمانوں کی ہے مگر حکومت وہاں غیر کر رہے ہیں۔
صفحات : ۲۰۲ قیمت : ۶۰ روپے

کلیلہ و دمنہ (باتصویر)

صدیوں پرانی کہانیاں جن کا عربی سے دنیا کی مختلف زبانوں میں بار بار ترجمہ ہو چکا ہے، اور اب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں، کہ ان میں بہت گہری اور کام کی باتیں بتائی گئی ہیں بچوں کے لئے زیر نظر ترجمہ اردو کے صاحب طرز ادیب انتظار حسین نے کیا ہے۔ صفحات : ۱۱۰ قیمت : ۳۰ روپے

ان کے علاوہ "گیت کھلونے" انتخاب رئیس فروغ (قیمت ۳۰ روپے)، ملک کے نامور ادیبوں کی تحریروں پر مشتمل "کہانیاں ہی کہانیاں" (۵۰ روپے) "آؤ سنائیں تمہیں کہانی" (۴۰ روپے)، "ایلی کا آئینہ گھر" (۴۰ روپے) "ایلی کا خواب نگر" (۴۰ روپے) سکول کے بچوں کے لئے منتخب ڈراموں پر مشتمل "کھیل ہی کھیل" (۴۰ روپے) اور سید ضمیر جعفری کا "رس میلہ" (۳۵ روپے)

ہر شہر میں شاکست درکار ہیں، براہ راست منگوانے کے لئے لکھئے:

شعبہ مطبوعات، ادارہ تحقیقات اسلامی، فیصل مسجد، پوسٹ بکس ۱۰۳۵، اسلام آباد